رخسانہ نگار عدنان

چھوٹی سی محبت

صبح کا تارہ پوری شدت سے جگر جگر کرتے ہوئے اپنا وجود قائم رکھنے کی کوشش میں افق کے پار گم ہوا جارہا تھا اور رات کی سیاہیاں صبح صادق کی سفیدیوں میں گھل کر مٹ رہی تھیں۔ ایک لمبی سیاہ رات کا خوشگوار اختتام سنہری دن کی شکل میں ہونے جارہا تھا

اور ایک مسافر کی لمبی مسافت اپنے انجام بخیر کو پہنچی تھی۔

میں سامان کی ٹرالی گھسیٹتا علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے لاؤنج سے باہر نکلا تو ایک خوشگوار صبح بانہیں پھیلائے مجھ سے معانقہ کرنے کو تیار تھی کہ فی

ناولٹ

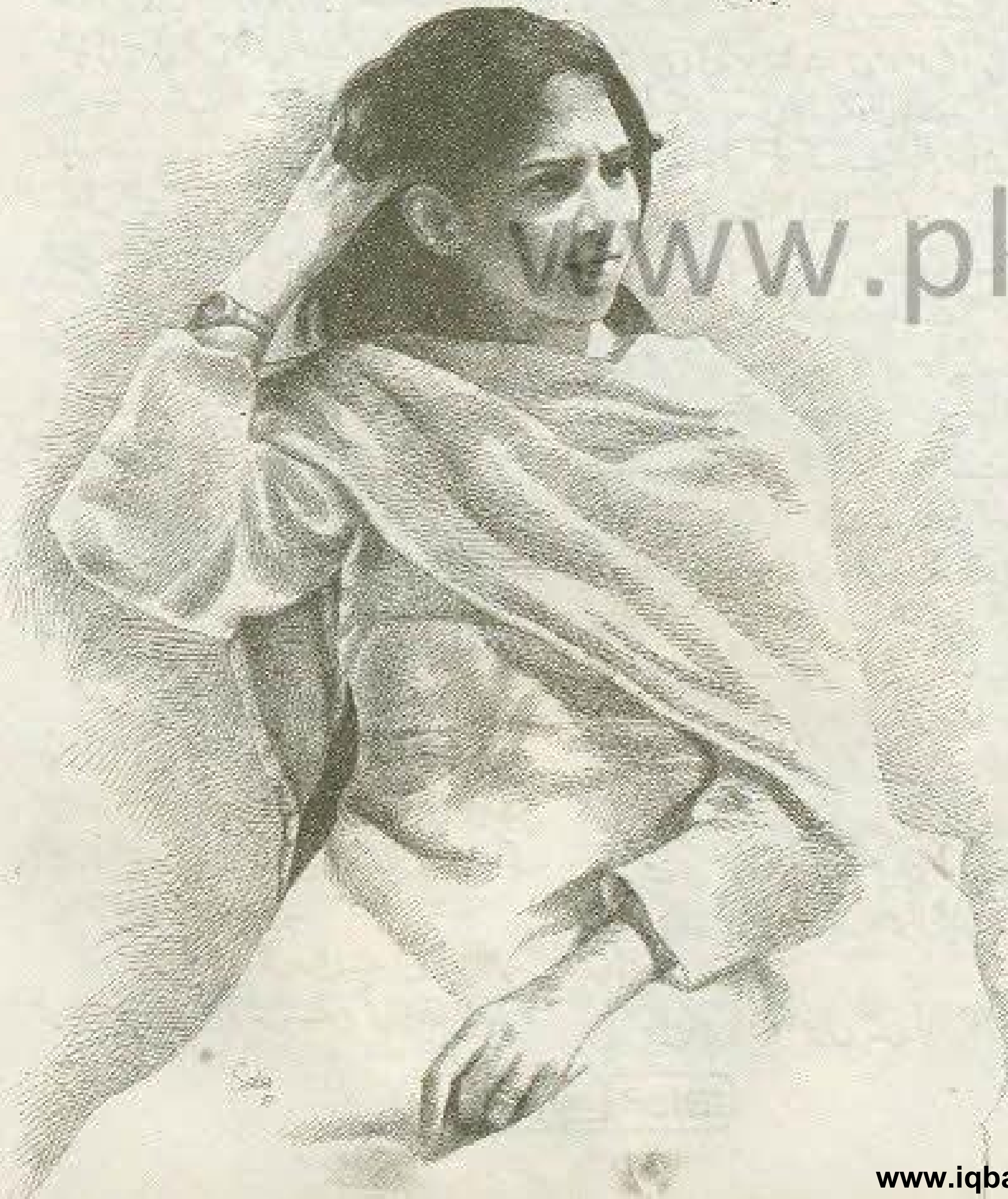


الحال اس وقت میں سوائے اس خوشگوار صبح کے اور کسی سے معانقہ نہیں کرسکتا تھا۔ سرپرائز دینے کا ایک ہی نقصان لمبی مسافت طے کرکے آنے والے کے لیے کافی نہیں بہت بڑا ہوتا ہے کہ سفر کے اختتام پر کوئی اپنا پُرجوش اپنائیت لیے بانہیں پھیلائے آپ کو اپنے استقبال کو نہ ملے اور اس نقصان کو میں نے خود اپنے لیے منتخب کیا تھا سو ملال بھی کم تھا۔

اور سچی بات ہے ملال یوں بھی کم تھا کہ ایئرپورٹ کے کمپاؤنڈ سے باہر آتے ہوئے مجھے اس نقصان پہ خواہ مخواہ نفع مل جانے کا خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ ایک بالکل دھلی دھلائی نکھری خوشگوار بھینی خوشبو والی پُر کثافت و آلودگی سے پاک فضا سے ملنے کا سرپرائز نفع بخش احساس!

ورنہ اس وقت اگر مجھے سب اپنے لینے کے لیے آئے ہوتے تو اس وقت ان سے گلے ملنے، جپھیاں ڈالنے، ہاتھ ملانے 'کیسے ہو' 'کیسے ہیں؟' کے مکرر سوال کے بیچ اس کنواری جتنی نویلی، سج دھج والی صبح سے ملنے کا کہاں موقع ملتا تھا۔

ٹیکسی پر سامان رکھواتے اور بیٹھنے تک میں پوری طرح اپنے پیارے وطن کی اس پیاری صبح کی نیم خنک خوشبو اڑا اٹکھیلیاں کرتی باد نسیم کے عشق میں گرفتار ہوچکا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ ٹیکسی ڈرائیور کس رشک بھرے انداز میں مجھے دیکھ رہا ہے اور منور بھائی کی اس تاکید کے باوجود میں ذہنی طور پر بالکل الرٹ



نہیں تھا کہ آج کل لاہور شہر چوریوں ڈکیتیوں حوالے سے زندہ دلان لاہور نہیں بلکہ زندہ دلان چوروں کا من پسند جنگل بن چکا ہے۔

میں کھڑکی سے کسی دیہاتی کی طرح پوری گردن نکالے اپنے دیس کی بانکی البیلی صبح کی سانسوں کو اپنی سانسوں میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کتنے عرصے بعد پاکستان آئے ہیں؟" میری اس بچکانہ بے صبری حرکت کو دیکھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے قیاس کیا ہوگا کہ میں شاید زمانوں بعد ادھر لوٹا ہوں۔

"ڈھائی سال بعد۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ٹھنڈی معطر ہوا سے بڑا سا گھونٹ بھرا اور ذرا سا سر اندر کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور لمحہ بھر کو حیران ہوا اور پھر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ابھی سفیدی پوری طرح پھیل کر روشنی میں نہ ڈھلی تھی۔ اس لیے سڑکیں بالکل صاف شفاف کسی بھی انسانی بھاگ دوڑ سے پاک بڑے آرام سے ایک ہی کروٹ کے بل لیٹی تھیں اور ٹیکسی گویا بغیر چپو کی کشتی کی مانند ان پر تیرتی چلی جا رہی تھی۔

میں باہر کے نظاروں میں مگن تھا اور ڈرائیور جمائیاں لیتے ہوئے مندی مندی آنکھوں سے ڈرائیونگ میں، دو ایک بار مجھے خیال آیا اسے ٹوکوں بھائی ذرا دس منٹ کو اس نیند سے رخصت لے لو ورنہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملے بغیر اس جہاں سے رخصت کرا دو گے پھر سوچا جیسے چل رہا ہے چلنے دو' وہ مجھے اکیلا تو رخصت نہیں کرائے گا خود اپنا بھی ٹکٹ کٹوانا پڑے گا۔

ٹیکسی فراٹے سے کینٹ کی سیاہ چمکیلی سڑکیں روندتی مال روڈ کی طرف رواں تھی۔ خوبصورت سماں، خوبصورت ماحول اور پُر فضا مناظر انسان کی طبیعت پر کیسے خوشگوار اثرات مرتب کرتے رہیں کہ میں ایک لمبے سفر تکان تک بھول گیا۔

"اور سناؤ یار! کیسی چل رہی ہے آج کل ادھر۔" طبیعت بشاش ہوئی تو میں نے یونہی بات کرنے کو ڈرائیور سے پوچھا۔

"آپ امریکہ سے آ رہے ہیں نا!" وہ مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے سرخ ڈوروں والی نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ تکتے ہوئے الٹا پوچھنے لگا۔

"ہاں نیویارک سے۔ تو؟"

"وہاں تو ہمارے بارے میں ہم سے زیادہ خبریں ہوتی ہیں۔ الٹا ہمیں ان سے پوچھنا چاہیے۔ انکل سام آج کل ہمارے ملک میں کیا چل رہا ہے' وہ زیادہ مفصل جواب دیں گے۔" ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کے منہ سے ایسی ہوش مندی کی بات کی مجھے توقع نہیں تھی۔

"اجی ہم تو وہ بدنصیب قوم ہیں جس کا وجود تو ادھر اس ملک میں چل پھر رہا ہوتا ہے اور سانسوں کا ریموٹ واشنگٹن اور نیویارک کے قبضے میں ہوتا ہے۔ دفع کریں جی! ایسا کرتا ہے اس موضوع کو صبح صبح نور کے تڑکے چھیڑ کر۔ جی جلانے والی بات۔" اس نے کہتے کہتے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ سے اٹھا کر ہوا میں چلایا اور زیادہ تن دہی سے گاڑی چلانے لگا۔

"مہنگائی تو ادھر آج کل زوروں پر ہے۔ تم سناؤ تمہارا گزارا ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے؟" میرے منہ سے غیر اختیاری سا سوال نکلا اور سوال کرنے کے بعد اس کی کٹیلی نگاہوں سے مجھے احساس ہوا کہ یہ سوال تو پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور جلا کٹا ہے۔

"رب سوہنے کا احسان ہے۔ ہماری محنت کی کمائی میں وہ برکت ڈال دیتا ہے۔ چار کی جگہ دو روٹیاں کھا کر پیٹ بھرا بھرا سا محسوس ہونے لگتا ہے نہ بھی ہو تو خود کو محسوس کروانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ اس کا احسان ہی ہوا نا۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ محنت کر رہے ہیں نہ چوری کرتے ہیں نہ ڈاکا ڈالتے ہیں نہ ایسا کبھی کوئی شیطانی خیال دماغ میں آیا سو رات کو دو تین گھنٹے ہی سہی سکون کی میٹھی نیند سوتے ہیں۔ شکر ہے اس کا۔" ٹیکسی ڈرائیور کا انداز عجیب بے نیازانہ سا تھا۔

"کبھی باہر جانے کا خیال نہیں آیا؟" گاڑی اب جی پی او کی پُرشکوہ عمارت کے پہلو سے گزرتی ہوئی جین مندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بائیں طرف ہائی کورٹ کی عمارت کی پیشانی پر بنا ترازو بے بسی سے سڑک پر گزرنے والوں کا دن بھر منہ تکا کرتا تھا۔ میں بھی بس لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھ سکا۔

"پہلے آتا تھا اب نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"اب کیوں نہیں۔" میں نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔

"اب جو پاکستانی ساری دنیا میں ننگے ہو گئے ہیں۔ اپنی ہی حکومت نے دہشت گردوں کے نام پر پکڑ پکڑ کر معصوم لوگوں کو ان کے حوالے کر کے ان کی ہمدردیاں لینے کے بجائے ان کی عمر بھر کی دشمنی خریدی ہے۔ اس کے بدلے جو سلوک پاکستانیوں کے ساتھ دوسرے ملکوں کی حدود میں داخل ہونے پر ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر تو جی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ سو بار اللہ توبہ کرتے ہیں۔ ادھر کی روکھی سوکھی وارے میں ہے۔ ہم ایسے ڈالروں اور پونڈوں سے باز آئے جن کے بدلے کپڑے اتار کر ٹکڑے ٹکڑے پر تلاشی دینی پڑے۔ عزت آبرو کے ساتھ اپنے ملک میں سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ کوئی انگلی اٹھائے تو سینہ تان لیتے ہیں۔ آدمی کو جینے کے لیے ڈالروں سے زیادہ عزت نفس کی ضرورت ہوتی ہے' وہ اللہ کا شکر ہے بہت نہ سہی تھوڑی بہت ادھر مل ہی جاتی ہے۔ باہر کے لالچ میں اسے بھی گنوا دیں۔" وہ مجھے ٹیکسی ڈرائیور کم کوئی دانش ور زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کی کچی باتوں نے مجھے چپ کرا دیا۔

سامنے چوبرجی کے چار مینار بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ صرف ان کے سر ہی اٹھے تھے ورنہ کہن سالی اور خستہ حالی نے جوان کا رنگ روپ اڑا رکھا تھا۔ ذرا جو سر جھکا کر خود کو دیکھ لیتے تو شاید اپنے ہی قدموں پر ملبے کے ڈھیر کی صورت پڑے ہوتے۔ یوں بھی ملبے کو ملبہ بنانے میں دیر کتنی لگتی ہے' ان خوبصورت تاریخی میناروں کو یوں اجڑی، بکھری بے رنگ سی حالت میں ندامت سے سر اٹھائے دیکھ کر مجھے حقیقتاً دکھ ہوا۔ میرے بچپن کے دنوں میں ان کی ایسی خستہ حالت ہرگز نہ تھی۔ میرے بچپن کی یادوں میں ان کا خوبصورت تصور موجود تھا۔ میں اسی تصوراتی نقشے کو سوچنے لگا۔

راؤنڈ اباؤٹ کے گرد گھوم کر ٹیکسی اب راج گڑھ کی گلیوں کا رخ کر چکی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ منزل اب دو گام ہی تو رہ گئی تھی۔

صبح سویرے کی سرگرمیاں ابھی پوری طرح سے متحرک نہیں ہوئی تھیں۔ دکانیں بند تھیں اور ان کے شٹر گرے دروازوں کے آگے کہیں کہیں کوئی مزدور منہ سر لپیٹے سو رہا تھا اور کہیں کوئی کتا اونگھ رہا تھا۔ بھولی بلیاں میاؤں میاؤں کرتی گلیوں کے اور دکانوں کے تھڑوں کے نیچے سے آ جا رہی تھیں۔

"بس یہاں سے دائیں طرف موڑ لو۔" میرے گھر کی گلی آ گئی تھی۔ میں نے ذرا پُرجوش سا ہو کر سیٹ پر آگے کھسکتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ اگلے لمحے گاڑی سرکتی ہوئی اس گہرے بھورے تھوڑا رنگ اڑے لکڑی کے دروازے کے آگے رک گئی تھی۔

میں نے نیچے اتر کر سامان اتروایا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر دروازے کی بغل میں گھنٹی کے بٹن کو دبا دیا۔

"بھاجی! یہ پچاس روپے زائد دے دیے آپ نے۔" ٹیکسی والا جاتے جاتے رکا۔

"یار! ایئرپورٹ پر کوئی اپنا نہیں ملا۔ تم اپنے ملے تو دیکھ کر خوشی ہوئی پھر تمہارے ساتھ سفر بھی اچھا کٹا۔ بچوں کے لیے شام کو کوئی میٹھی چیز لے جانا کہنا۔ ان کے چاچے نے بھیجی ہے اور یہ بھی۔"

میرے کوٹ کی جیب میں چاکلیٹ کا بڑا پیک بند ہی پڑا تھا سوچا تھا راستے میں کھاؤں گا۔ اس کی نوبت نہیں آئی' وہ پیکٹ پکڑتے ہوئے متذبذب سا ہوا۔ میں نے اصرار کیا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں ایک معمولی سے ٹیکسی ڈرائیور پر اتنا مہربان کیوں ہوا۔ مجھے خود پر حیرت سی ہوئی' واقعی کوئی اپنا نہ

ملے تو اپنے وطن سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص ملے، وہ اپنا ہی لگتا ہے۔

"بھامنور تو صبح سویرے اٹھ کر موڑھے کے تھڑے پر بیٹھ کر مسواک کرنے کے عادی ہیں۔ آج وہ بھی نظر نہیں آرہے۔" میں نے ویران پڑی گلی کو قدرے تشویش سے دیکھا۔ اب تو اچھا خاصا دن نکل رہا تھا پھر میں نے تیسری بار گھنٹی کا بٹن دبایا۔

"کمال ہے گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں سب....." اب کے میں خاصا جھلایا تھا۔

"کون ہے پاگل، سویرے سویرے گھنٹیاں بجائے جارہا ہے۔" فریدہ کھڑکھڑاتی، سلیپر گھسیٹتی حسب عادت بدمزاجی سے بولتے ہوئے باہر نکلی تھی۔

اب اگر میں جواب میں "میں" کہہ دیتا تو اس نے اونچا اونچا شروع ہو جانا تھا۔ "کیا بکری کی طرح میں میں لگا رکھی ہے۔ سیدھی طرح اپنا نام بتاؤ۔"

"بھئی۔ کھولو دروازہ۔ حد ہو گئی۔ اتنی دیر سے بیل بجا رہا ہوں۔ مدثر ہوں میں۔" بکری کہلوانے کے ڈر سے میں نے فوراً اپنا تعارف کرا ڈالا تھا۔

"ہائے اللہ جی!" دروازہ تو وہ کھول ہی چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ سے فوری طور پر یہی نکل سکا۔ بے یقین سی نظروں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ "آپ تسی ... توبہ حد ہو گئی اطلاع تو دیتے۔ سویرے سویرے کوئی لینے آجاتا۔" خوشی سے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"نہ سلام نہ دعا ہائے اللہ جی۔ تسی کم دیکھا کرو پنجابی فلمیں۔"

میں اس کی خوشی سے محظوظ ہوتے ہوئے آگے بڑھا اور ہولے سے اس کی کلائی موڑ دی۔ وہ ایک بار پھر "ہائے اللہ جی" کہہ کر تھوڑا پیچھے ہو گئی۔ اس کی اسی کیفیت سے انجوائے کرنے کے لیے میں نے یہ سرپرائز دیا تھا۔

سامان اندر رکھ کر دروازہ بند کر کے میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے صحن میں آگیا۔

صحن کی شمالی دیوار کے ساتھ لگے نیم کے درخت کے پتے خوب ہرے بھرے ہو رہے تھے اور ان پر بیٹھی چڑیوں نے خوب شور مچا رکھا تھا۔

"تین دن پہلے تو بات ہوئی تھی آپ نے ذکر ہی نہیں کیا۔ آج میرا ارادہ تھا آپ کو فون کرنے کا۔ اچانک پروگرام کیسے بن گیا؟" وہ ابھی بھی خوشی اور حیرت کے بیچ ڈول رہی تھی۔

"بس دیکھ لو۔ تم لوگوں کی یاد آئی تو دوڑا چلا آیا۔"

میں اسی نیم کے درخت کے نیچے پڑی جھلنگا چارپائی پر ترچھا ہو کر نیم دراز سا ہو گیا۔ فریدہ مجوب سی میرے پاس بیٹھ کر نیچے جھکی اور میرے جوتے اتارنے لگی۔

"رہنے دو میں خود ابھی اتار لیتا ہوں۔" میں نے سیدھا ہونا چاہا تو اس نے دوسرا ہاتھ میرے پہلو پر رکھ دیا۔ میرے پورے بدن میں لطیف سی سنسنی دوڑ گئی وہی نا سمجھ میں والا سکون جو مجھے پردیس سے آنے کے بعد گھر میں داخل ہو کر فریدہ کے نشیلے لمس سے محسوس ہوا کرتا تھا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں میچ لیں۔

"بچے سو رہے ہیں ابھی تک؟" میں نے اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں ابھی ٹائم کیا ہوا ہے؟" وہ اب اپنے نرم ہاتھوں سے میرے پیروں کو جرابوں کی قید سے نکال رہی تھی۔ اس نے ہاتھ لگایا تو میرے پیروں نے اپنی تھکن کا برملا اظہار کر ڈالا۔ وہ ان ہی ہاتھوں سے میرے پیروں کو ہلکا ہلکا دبانے لگی۔

"بس کرو... کیا مجھے یہیں سلا دو گی۔ پہلے بچوں سے مل لوں، یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے کیا؟" بچوں کو دیکھنے کے خیال سے میں ایک دم اٹھا اور کھڑا ہو گیا۔

"کبھی کسی دن زبردستی کروں تو پڑھ لیتے ہیں ورنہ....."

"آج تم نے خود بھی نہیں پڑھی ہو گی۔" میں نے مڑ کر شکایتی لہجے میں کہا تو وہ کھل کر مسکرا دی اور زور زور سے بچوں کو پکارنے لگی۔

"گڈو کے پیپرز شروع ہو گئے؟"

"نہیں۔ اگلے ہفتے سے ہلا پر جا ہے۔ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا ہے اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہے۔" بچے

میری آمد کا سنتے ہی بڑبڑا کر اٹھ چکے تھے اور اب دائیں بائیں آگے پیچھے سے مجھ سے لپٹے جا رہے تھے۔

"میری گڑیا اتنی بڑی ہو گئی۔" میں واقعی صدف کو دیکھ کر حیران سا رہ گیا تھا۔ ڈھائی سال پہلے جب میں آیا تھا تو وہ میری کمر تک آتی تھی اور اب جیسے گڈو کے برابر ہوئی جا رہی تھی اور ٹیپو بھی ان کے ساتھ کھڑا ان کے برابر کا لگ رہا تھا' صرف نوال ابھی بھی کچھ کم سن سی تھی۔

"بیٹیاں تو اسی طرح بڑی ہوتی ہیں۔ ابھی دیکھو تو گڑیا سے کھیلتی اور ابھی دیکھو تو..." فریدہ نے ماؤں کے روایتی فکر مند لہجے میں کہا اور میں ہنس پڑا۔

"اور میں اپنی گڑیا کے لیے ابھی بھی باربی ڈول ہی لایا ہوں۔" وہ مجھے گڑیا سے کھیلنے کے لیے خاصی بڑی لگ رہی تھی۔

"اور ابو! میرے لیے؟" ٹیپو فوراً اپنا چہرہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولا تو میں نے بے اختیار جیسے اپنے ہی عکس کی پیشانی پر لب رکھ دیے۔ ٹیپو تو بالکل مجھ جیسا لگ رہا تھا۔

"سب کے لیے سب کچھ لائے ہوں گے ابو' پہلے انہیں سانس تو لینے دو۔ ناشتا بناؤں آپ کے لیے یا بازار سے منگواؤں؟"

فریدہ محبت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس نے کیسا گھسا ہوا ملگجا سا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ عجیب جوگیا سے رنگ کا اور بال جیسے کتنے دنوں سے بنائے ہی نہیں پھر بھی مجھے اس پر پیار آ رہا تھا۔ ان ہی صورتوں کو تو اس برفیلے علاقے میں سفید سفید برف جیسی پتھریلی صورتوں کو تکتے ہوئے ترس جایا کرتا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر آرام کروں گا پھر بھامنور اور منظور کو بھی بلا لو۔ ابھی تو وہ گھر ہوں گے پھر کاموں پر نکل جائیں گے تو رات سے پہلے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔"

میرے دونوں بھائیوں کے گھر بھی اسی گلی میں تھے اور میرا دل اپنے ماں جائیوں کو دیکھنے کے لیے بھی اتنا ہی بے چین تھا جتنا فریدہ اور بچوں کو دیکھنے کے لیے۔

"مل لیجیے گا۔ ابھی منٹلی کی منٹلی اٹھ کر آ جائے گی پھر تو آپ کے پاس ہمارے لیے گھڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ وہ دونوں دیر سے ہی جاتے ہیں۔ آپ ناشتہ کر لیں پھر بلوا لوں گی۔"

فریدہ ایک دم سے چہرہ سخت کرتے ہوئے کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ اسے یقیناً ان تین سوٹ کیسوں کو پچھلے کمرے میں رکھوانے کی جلدی ہو گی کہ دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں بچوں کی ان پر نظر نہ پڑ جائے۔ اس معاملے میں فریدہ کسی سے بھی رعایت نہیں برتتی تھی کہ میرے حق حلال اور خون پسینے کی کمائی پر وہ خالصتاً "اپنا اور اپنے بچوں کا حق" سمجھتی تھی۔ اپنے دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں سے بھی "مال غنیمت" کو چھپایا کرتی تھی۔ یہ اس کی بچوں سی خوشی تھی تو میں اس کی خوشی میں کیوں رخنہ ڈالتا۔ یوں بھی اتنے سالوں بعد تو ہم ملتے تھے۔ میں تو ایک پل کے لیے بھی اس کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میرا ہی حال نہیں تھا۔ فریدہ بھی میری دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی۔ یہی سوچتا سوچتا میں غنودگی میں چلا گیا۔



سارا دن ہی گہما گہمی میں گزرا ایک تو میری آمد نا اطلاع تھی' دوسرے بھامنور کی افشاں کی شادی ان دنوں طے کرنے کا سوچا جا رہا تھا۔ میری آمد نے بھامنور کے جوش کو بڑھا دیا۔

"بس بھئی۔ شادی کی تاریخ اسی مہینے کے آخر تک رکھ لو۔ مہینہ تو اپنا مدثر ادھر ہی ہے۔" کیم شیم سے بھامنور نے مجھے اپنی بغل میں لیتے ہوئے خوب اونچی آواز میں کہا۔

"ارے نہیں بھا! میں تو..." ان کی بغل کی گرفت میں میری پسلیاں تو کیا جھنجھنائیں' سانسیں بھی گڈمڈ ہو کر باہر نکلنے سے انکاری ہو گئیں۔

"میں تو کیا... کتنے دنوں کے لیے آیا ہے؟" انہوں نے جھٹکے سے مجھے اپنی بغل سے پرے کیا۔

"صرف ایک ہفتے کے لیے۔" بھامنور اور دوسرے تو شاید مجھے بعد میں گھورتے' برآمدے سے گزرتی فریدہ نے یہ سنتے ہی سامنے سے گزرتی گڑیا کی کمر میں زور سے دھپ لگا دی۔

"دفع ہو مرو اندر جا کر۔ سارا دن ادھر تو میلہ لگا رہے گا۔ تم بھی دانت نکالتی ڈھیلے پھاڑتی ادھر تکی رہو گی۔"

فریدہ کی آواز اور الفاظ دونوں ہی ایسے کاٹ دار تھے کہ صحن میں بیٹھی قہقہے لگاتی محفل کی ہنسی یک لخت تھم گئی۔

"چلو بھئی۔ کچھ دیر مدثر کو بھی آرام کر لینے دو۔ شام کو گپ ہو گی۔ زبیدہ کو فون کر دیا تو نے مدثر؟" بھامنور سب سے سیانے تھے۔ اگلے کا چہرہ دیکھ کر اس کے ارادے بھانپ لیا کرتے تھے انہوں نے اٹھتے ہوئے محفل برخاست کر دی۔

"ابھی کروں گا' ویسے میرا خیال تھا۔ میں کل یا پرسوں جا کر خود ہی مل آتا۔ پانچ چھ دن تو میں ہوں ادھر۔"

میں نے تھوڑا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ فریدہ بھی کبھی حد ہی کر دیتی تھی۔ میں کون سا روز روز بھائیوں کی منٹلی سجا کر بیٹھا کرتا تھا۔ سالوں بعد تو یہ موقع ملتا تھا' وہ بھی نصیبوں کی بات؟ مجھے غصے کے ساتھ رنج سا بھی ہوا۔

"او ہو! ادھر ہی بلا لیتے ہیں۔ قصور کون سا دور ہے بلکہ بہن بھائی ذرا دو گھڑی بیٹھ جائیں گے۔ اب تو وہ بھی مہینوں نہیں آتی۔ شکیلہ تو چلو پردیس میں ہوئی۔ تم رہنے دو' میں جا کر اسے فون کر دیتا ہوں۔" بھامنور بات ختم کرتے ہوئے اپنے بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو آگے لگائے باہر نکل گئے۔ بھرجائی پہلے ہی جا چکی تھی۔

فریدہ اب کچن میں برتن کھڑکانے میں لگی ہوئی تھی۔ ان کھڑکتے برتنوں کا صاف مطلب مجھے اندر بلانا تھا۔ تھوڑا نخرا تھوڑی الفت جتانی۔ پر نہ جانے کیوں اس گھڑی میرے دل میں جیسے اداسی لہر لہرا کر آ گئی

تمیں جمانے لگی تھی۔

اسی ویہڑے میں بے بے اور ابا جی کبھی اس چارپائی پر بیٹھ کر ہم تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو اونچی اونچی آوازوں میں بلایا کرتے تھے اوپر والی منزل پر چاچا بشیر' ان کے چار بچے اور بیوی رہتی تھی۔ ابے سے تین سال چھوٹا تھا چاچا بشیر' زمانے بھر کا نکھٹو اور ناکارہ۔ سارا دن اوپر والی منزل پر برتن کھڑکتے یا تکا فضیحتی رہتی تھی۔ تیسری منزل پر ابے کا چاچا شریف اپنی بیوہ بیٹی اور اس کے تین بچوں کے ساتھ رہا کرتا تھا یعنی اس ساڑھے تین مرلے کے گھر میں اٹھارہ افراد رہا کرتے تھے اور اوپر چوبارے میں بے بے کا نشئی بھائی' ماموں طفیل' فالتو کاٹھ کباڑ کے ساتھ دن رات منہ کھول کر ہاتھ پیر چھوڑے سویا رہتا تھا۔

ہمارے گھر کے دو کمرے' یہ مٹی کا صحن اور برآمدے میں کھلا باورچی خانہ خاندان کے اچھے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنے بھائی کے برعکس ابا مکینک تھے۔ اپنی کوئی باقاعدہ دکان تو نہیں تھی۔ پر سارے علاقے کو معلوم تھا' یہ سراج دین بجلی کا بڑا اچھا مکینک ہے۔ اس وقت چونکہ بجلی کے اتنے آلات نہیں تھے۔ موٹریں اکا دکا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ محلوں میں سرکاری پانی کی فراوانی تھی سو ابا کی کمائی تو زیادہ نہ ہوتی مگر پھر بھی ہمارا گزارا اچھا ہو ہی جاتا۔ محلے میں ہونے والی ایک آدھ شادی میں بتیاں لگانے کا کام مل جاتا تو چند دن کام کے بغیر بھی اچھے گزر جاتے۔

ہم سب ابا اور ابے کی کمائی کو "موہنی" سمجھا کرتے تھے۔ بے بے تو اکثر طعنے بھی دیا کرتی تھی۔

"جا جا کر دیکھ لوگوں نے گھروں میں کیا ریل پیل لگا رکھی ہے۔ اوپر تیرا بھائی بشیر ہی نہیں — موسم کی پہلی سبزی' پہلا پھل خواہ کتنا مہنگا کیوں نہ ہو اس کے گھر آتا ہے اور ہم جب وہ پھل سبزی موسم کے درمیان میں ٹکے ٹکے سیر بک رہا ہوتا ہے' تب نصیب ہوتا ہے۔ تو ہمارے لیے کرتا کیا ہے۔ منورے کو بیچ کرا کے اٹھا لیا۔ یہ مدثر اور منظور رو رو کر پانچویں

کرلیں تو انہیں بھی گھر بٹھا کر مکینکی سکھا دیتا۔ نہیں تو منورے کی طرح بیٹھے منجیاں توڑا کریں گے کوئی چار دن ہم بھی اچھے دیکھ لیں۔"

یہ شاید بے بے کا ناشکرا پن تھا کہ چار دن اچھے آتے اللہ نے ناراض ہو کر ان گنے گزرے موافق دنوں کو بھی ہمارے بیچ سے اٹھا لیا۔

میں نویں میں تھا اور منظور ساتویں میں۔ بھامنور نے چاچا بشیر کی الفت سے خوب الفت بڑھانے کے بعد گھر میں ترلیاں دھمکیاں لگا کر ابے اور بے بے کو شادی پر راضی کر لیا تھا اگرچہ ابھی تک بھامنور نے کام کے نام پر بھی تنکا دوہرا نہیں کیا تھا۔ چاچا بشیر کے "اچھا سوچتے ہیں۔" کا جواب سن کر ابے نے بھامنور کو کسی دکان میں نوکر رکھوا دیا۔

پہلی تنخواہ آئی تو بقول اماں کے "شریکوں کے منہ بند ہو گئے۔" اور چاچے بشیر کو بغلیں جھانکتے ہوئے ہاں کرتے ہی بنی۔

الفت اوپری منزل سے نیچے آ گئی اور ہمارا گھر جو پہلے ہی سکڑ سکڑ کر دو کمروں میں گزارا کر رہا تھا۔ ایک کمرے میں آ گیا۔ ابا اور بے بے مستقل برآمدے میں منتقل ہو گئے۔ ان ہی دنوں ابا نے اپنے رشتے کی بہن کے گھر زبیدہ کا رشتہ طے کر دیا۔ تاریخ رکھی تھی کہ ایک گھر میں موٹر ٹھیک کرتے ہوئے ابے کو جو بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کا دوسرا سانس نہ نکلا اور ہمارے گھر سے وہ گنے گزرے دن بھی اٹھ گئے۔

زبیدہ کی شادی میں گھر کے بس دو چار برتن بھانڈے بکنے سے رہ گئے اور جو قرض چڑھا وہ علیحدہ۔ ابے کی جدائی، معاشی ابتری اور گھر میں بڑھتی ہوئی الفت کی زور آوری نے بے بے کو مستقل چارپائی پر ڈال دیا۔ میں دسویں بھی مکمل نہ کر سکا اور منظور نے ساتویں بھی نہ کی۔ مجھے شروع سے ابے کے کام سے دلچسپی تھی اور میں بچپن سے اکثر ساتھ ہی جایا کرتا تھا۔ فیوز لگانا، پنکھا لٹکانا، بلب، ٹیوب لائٹ، موٹر فٹ کرنا۔ شادی بیاہ میں بتیاں لگانے کے لیے کنکشن کی تاریں کہاں جوڑنا ہیں۔ سب ابے کے سکھائے بغیر ہی سیکھ گیا تھا اور پتا بھی نہیں چلا۔ کب لوگ سراج دین کے دروازے پر آ کر دڑے کی آوازیں لگانے لگے اور میں اپنا ٹول بکس وہ پیچ کس، ٹیسٹر اور دوسرے اوزاروں کا تھیلا اٹھا کر ان کے ساتھ نکل پڑتا۔

بھامنور کی بدمزاجی نے انہیں دو چار ماہ سے زیادہ پہلی نوکری پر ٹکنے نہیں دیا۔ وہ چار مہینے کام کرتا اور آٹھ مہینے گھر بیٹھ کر ماں اور بیوی کے معرکوں میں کبھی ایک فریق کا حامی بن کر جوتے طعنے کھاتا تو کبھی دوسرے کی لاتیں۔ اب گھر کی ساری ذمہ داری خود بخود میرے کندھوں پر آ گئی تھی۔

فریدہ ماما صدیق کی تیسرے نمبر والی بیٹی تھی۔ اس سے پہلے دو بھائی اور بعد میں ایک بہن تھی۔ وہ خود کیسی تھی۔ مجھے اس کا احساس ان ہی دنوں ہوا تھا جب وہ بہانے بہانے سے ماں کے ساتھ بن ٹھن کر بے بے کی خیریت پوچھنے اور الفت بھابی سے ہونے والے معرکوں کی تفصیل جاننے کے لیے آیا کرتی تھی۔ سوکھی چوہیا جیسی چوٹی کو اپنے بالوں سے دگنے بھاری پراندے میں لپیٹے۔ فریدہ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پر اس کی غلافی موٹی موٹی آنکھیں اس کے سوکھے ہڈیوں کے ابھار والے رخساروں اور بڑے سے دہانے کے سارے عیب کو انوکھے سے پرسوز حسن میں بدل دیتی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے ان دنوں ڈسٹرب کرنا شروع کر دیا جب مجھے عشق محبت کے معنی معلوم تھے نہ ان کو پالنے کا وقت۔ پھر بھی قدرت نے جیسے میرے معصوم جذبۂ شوق کو بھانپتے ہوئے فریدہ کو ہنگامی بنیادوں پر میرا نصیب بنانے کا فیصلہ لکھ ڈالا۔

بے بے کو ایک رات دل کا دورہ پڑا۔ دورہ تو معمولی تھا پر اس کے نفسیاتی اثرات بڑے سنگین تھے۔

اور نا معلوم میرا بے بے پر کیا بھار تھا کہ اس نے اگلے دو دنوں میں اس جان لیوا دورے سے سنبھلتے ہی شاموں شام بھائی کی منت ترلے کر کے میرا اور فریدہ کا نکاح پڑھوا دیا۔ منظور اور شکیلہ کو بے بے کے ساتھ دوسرا کمرہ چھوڑ کر برآمدے میں اپنے بستر لگانے پڑ گئے۔

فریدہ سے میں نے بہت توقعات نہیں باندھی تھیں اور نہ وہ مجھے کوئی سیدھی سادی لگتی تھی جو آتے ہی الفت بھابھی کی طراریوں کے آگے ہتھیار ڈال دے گی۔ میں دل ہی دل میں گھر میں برپا ہونے والی نئی جنگوں کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا مگر میرے خیالات کے بالکل برعکس فریدہ بہت محبت کرنے، خیال رکھنے والی اور تھوڑی کم گو نکلی۔ اپنے طبقے کی دوسری لڑکیوں سے خاصی مختلف۔ یہ مجھے خاصی خوشگوار سی حیرت ہوئی اور بے بے اسے سراسر میری خوش قسمتی گردانتی تھیں۔

اور میں جس دورے کو معمولی جان رہا تھا۔ وہ میری شادی کے تیسرے مہینے بے بے کی جان لے گیا اور برآمدے میں شکیلہ اور منظور کی چارپائیاں رہ گئیں۔

برآمدے کے اس سونے منظر کو یاد کرتے میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ میں آنکھیں مسل رہا تھا جب فریدہ کھسر پھسر کرتی ناراض چہرہ لیے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کچھ دنوں کے لیے آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی جہاں ڈھائی سال سے دل پر جدائی کا پتھر رکھے تھی وہاں بٹھا اور مہینے ہو لیتی۔ ڈھائی سالوں بعد مہینے کی چھٹی بہت زیادہ لگی تھی کیا؟"

وہ ناراض ناراض لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے مجھے اس لمحے کتنی اپنی اپنی سی لگی تھی، بالکل اولین دنوں جیسی جب مجھے رات کو کسی تقریب میں کام کی وجہ سے دیر ہو جاتی تو وہ بے چین سی برآمدے اور صحن میں بہانے بہانے سے چکراتی رہتی۔

"میں وہاں ملازم ہوں میری جان! کوئی اپنا بزنس نہیں کہ اپنی مرضی سے جب چاہوں مہینے کی چھٹی لے کر آ جاؤں۔ مجبوری ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"اور نیا شوشا سنا ہے آپ نے، یہ جو آپ کے بھائی بیٹھے خوش گپیاں بگھار رہے تھے یونہی بے سبب نہ تھیں۔" وہ ایسی متعصب تو کبھی نہ رہی تھی۔ میں نے کچھ غور سے فریدہ کو دیکھا۔

"آپ آئے ہیں تو پلاٹ کا کام شروع کروا کے جائیں۔" وہ چند لمحے میرے استفسار کا انتظار کرنے کے بعد بولی۔

"اتنے دن تو نہیں ہوں میں ادھر۔" میں نے ذرا افسردگی سے کہا۔

"آپ کے بھائی صاحب منور بھا نے سارے خاندان میں پھیلا دیا ہے کہ مدثر اپنا یہ والا گھر مجھے دے جائے گا۔ اس کی تو گلبرگ میں کوٹھی تیار ہو رہی ہے، اس نے اس کھنڈر کا کیا کرنا ہے۔ خریدنا اس ملبے کو کسی نے ہے نہیں۔ میرے بچے جوان ہیں۔ کب تک کرائے پر لے کر دھکے کھاتا رہوں۔ اس بار مدثر آئے گا تو اپنے نام پر گھر کروا لوں گا۔" فریدہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کو میں بھی چپ سا رہ گیا۔

میرے پردیس کی مشقت بھرے، تکلیف دہ ابتدائی سالوں کی کمائی تو اس گھر جسے فریدہ بھی کھنڈر اور چڑیا گھر کے نام کے سوا بلاتی نہیں تھی کو اپنے نام کرانے میں لگ گئی۔ چاچا بشیر کو موٹی رقم دے کر ان کا حصہ دیا پھر ابے کے چاچا شریف اور اس کی بیوہ بیٹی کو لاکھوں دے کر نکالا اور ماما طفیل اس کا نشہ پانی تو ابھی تک میرے بھیجے ہوئے روپوں سے چلتا تھا۔

"اتنے سالوں کی محنت کی کمائی جو اس کھنڈر کو اپنے نام کرانے میں برباد کی، وہی ہم اپنا حصہ لے کر کہیں کرائے پر یا ایک کمرے کا گھر لے کر رہ لیتے تو آج لوگوں کی حریص نظریں نہ ہماری طرف لگی ہوتیں۔" فریدہ اسی تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہارے اور بچوں کے اکیلے رہنے کا خیال تھا۔ یہ گھر، گلیاں، محلے سمجھو اپنے ہی تو ہیں سب پھر تمہارے بھائیوں کے گھر بھی پاس۔ میرے بعد تم اکیلی کہیں اور کیسے رہ سکتی تھیں۔"

یہ اکلوتی دلیل تھی جس کے ذریعے میں ہر بار فریدہ کو یہیں رہنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں، غلط کرتا تھا۔ کیا فائدہ ہوا لاکھوں ڈبونے کا۔ اب اگر بھامنور نے یہ مشہور کر دیا ہے تو لامحالہ مجھے یہ کرنا

پڑے گا۔ اس وقت خاندان بھر میں ان سے گیا گزرا اور لمبے چوڑے کنبے والا کوئی اور نہیں تھا میں یہ گھر بیچ کر چار پیسے وصول لوں گا تو سارا خاندان تھو تھو کرے گا۔ بھامنور کے چار بیٹے تھے اور چاروں باپ کی طرح نکھٹو کام چور۔ چار بیٹیاں کوٹھے جتنی اونچی لمبی۔ سب شادی کے لیے تیار! فریدہ کا غصہ بے جا نہیں تھا۔

"اچھا چلو۔ پکایا کیا ہے؟ بھوک لگی ہے۔ یہ بچے کدھر ہیں؟" میں نے فی الحال اس بوجھل موضوع سے دماغ ہٹانے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا اور اندر چل دیا۔

"ہاں۔ میرے کہے کی پروا نہ کرنا۔ سب لٹا دو ان طفیلیوں پر، ان کی تو نہ نیت بھرتی ہے نہ بھوک مٹتی ہے۔ خود کولہو کے بیل بنے رہو اور ان کے ہاتھ پھیلتے رہیں۔ پہلی بار انکار کیا ہوتا تو آج منہ پھاڑ پھاڑ کر حق نہ جتا رہے ہوتے۔ حصہ بھی وصول لیا۔ اکڑ کر جیبیں بھر کر نکلے اور اب پھر دعوے دار بن کر آگئے، سارے خسارے کیا ہمارے لیے ہیں، جدائی میں اور بچے جھیلیں اور میٹھا میٹھا یہ ہپ ہپ کھاتے جائیں۔ مطلبی، موقع پرست۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی۔"

فریدہ کی بڑبڑاہٹ کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد بھی جاری رہی۔

میں کھانے کے بعد لیٹا بچوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اب فریدہ کچن سے فارغ ہو کر آئی تو ان سوٹ کیسوں کو کھولنے کی مہم سر کی جاتی۔ فریدہ تو نہ آئی۔ اس کی دونوں بھابیاں اور بھائی آگئے پھر ان کے ساتھ باتیں کرتے، چائے پیتے، شام ہو گئی۔ ان کے آنے سے فریدہ کا موڈ بھی قدرے بہتر ہو گیا مگر شام ڈھلے بھامنور اور منظور پھر سے آگئے تو اس کے چہرے کا تناؤ پہلی حالت پر چلا گیا تو میں دونوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ محلے کے پرانے یار دوستوں اور ابا کے دوستوں سے ملنے، سلام دعا کے بہانے۔

اور باہر جا کر سب سے ملنے کے دوران واقعی میرے دل پر چھائی اداسی کی لہر کہیں کم ہوتی چلی گئی۔ جب رات گئے میں گھر لوٹا تو صاف ستھرے گھر کے ساتھ فریدہ بھی خوب بنی سنوری ہوئی تھی فالسئی کلر کے سوٹ پر شاید کوئی کڑھائی تھی یا مقیش میں تمیز نہیں کر سکا جو بھی تھا۔ اس کے قدرے صحت مند جسم پر خوب اٹھ رہا تھا۔ کندھوں تک کٹے بال تازہ شیمپو کیے ہوئے تھے اور ہلکے میک اپ کے ساتھ تیز کلر کی لپ اسٹک اسے پرکشش بنا رہی تھی اور دن بھر کے مقابلے میں اس کے حلیے کی طرح اس کا مزاج بھی شگفتہ ہو رہا تھا۔

اس نے کھانے میں بھی اپنے ہاتھ اور سلیقے کی تمام تر کوشش کو مجتمع کیا تھا مٹن بریانی مجھے پہلے بھی اس کے ہاتھ کی پسند تھی۔ آج تو اس کا ذائقہ اور خوشبو دونوں لاجواب تھے اور میٹھے میں فرنی دونوں میری پسند کی چیزیں تھیں، احتیاط کرتے ہوئے بھی میں بہت زیادہ کھا گیا۔

اس نے بچوں کو جلدی سونے کے لیے بھیج دیا یوں بھی بچوں کو اپنے تحائف مل چکے تھے اور وہ زیادہ وقت اپنے چیزوں کے ساتھ گزارنا چاہ رہے تھے۔ ابھی رشتہ داروں کو دیے والے تحائف کی بندربانٹ باقی تھی اور یہ تکلیف دہ مرحلہ صبح ہی طے ہوتا تھا۔

"اتنا عرصہ کیسے میرے بغیر گزارا کرتے ہو؟"

اور یہی وہ مرحلہ ہوتا تھا جب بھی میں واپس آکر اس کی قربت کا طلب گار ہوتا۔ وہ بھڑک اٹھتی پھر شکوک و شبہات سوالوں اور مفروضوں اور میری دلیلوں قسموں وعدوں ارادوں کی طویل فہرست ہوتی جو میں اس کے حضور پیش کرتے کرتے تھک جاتا اگرچہ انجام کار وہ ایک مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی رضا و خوشی کی خاطر سرینڈر تو کردیتی مگر میرے دل میں بال سا آجاتا کہ اسے میرا یقین کیوں نہیں۔ کس طرح پردیس میں پھر اس دیس میں کہ جہاں قدم قدم پر ترغیبات یوں سر راہ آدمی کا رستہ کاٹتی ہیں جیسے کوئی نشان راہ اور میں کیسے کیسے ان ترغیبات سے نگاہیں چرا کر راستہ بدلتا ہوں، یہ میں جانتا ہوں یا میرا اللہ۔

"مرد ہو کر کیسے اتنے پاک باز رہ سکتے ہو، وہ بھی اس شہر میں جہاں قدم قدم پر راستہ روکنے والی ہوں گی۔"

وہ سرینڈر کرتے کرتے بھی طعنہ مار جاتی اور میرے پاس دلیلیں کم پڑنے لگتیں۔

میں جانتا ہوں کہ میں اپنی قسموں میں کتنا سچا ہوں اور اس کے ساتھ بندھے ہوئے تعلق میں کتنا کھرا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں آتا تو اس مقام پر آکر میرا دل چاہتا میں اسے لات مار کر سارے شکوک تھوپتے ہوئے ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر دفع ہو جاؤں اور اس سے صرف ڈالرز کے ٹرانسفر کا تعلق رکھوں اور سارے تعلق توڑ ڈالوں۔

مگر اس کے باوجود میں ایک کمزور شوہر تھا کہ کسی بھی صورت اپنی بیوی سے نہ تو بے وفائی کر سکتا تھا نہ اپنی تذلیل پر قطع تعلق۔

وہ اب میرے پہلو میں مطمئن سو رہی تھی اور میں کڑھ رہا تھا۔



اگلی صبح کافی لے دے کے بعد فریدہ سب کو وہی تحائف دینے پر راضی ہو ہی گئی جو میں سب کے لیے لایا تھا۔

"ابھی راشد بھائی آئیں گے۔ جا کر پلاٹ پر ہو آیئے اور ٹھیکے دار سے مل کر سارا نقشہ اور خرچ سمجھ لیجیے۔ اب میرے بھائیوں نے تو سارے ٹھیکے نہیں لے رکھے۔ پلاٹ بھی خرید کر دیا۔ اب اس کی تعمیر کے لیے بھی وہی بھاگ دوڑ کریں۔"

میں بھی کچھ حیران تھا۔ فریدہ نے کل سے بھائی کے کارنامے کو جتایا نہیں اور میں بھی جتاتا جتاتا رہ گیا کہ تمہارے بھائی نے جو پلاٹ کی رقم سے کٹوتیاں کرکے اسی علاقے میں اپنا پلاٹ خریدا ہے۔ کیا ایک کرائے کی وڈیو شاپ سے گلبرک کے پوش ایریے میں سات مرلے کا پلاٹ لینا ممکن ہے اس کے لیے؟ میری شوہرانہ وفاداری پھر آڑے آگئی۔

"اچھا چلوں گا لیکن تعمیر کے لیے یکمشت اتنی بڑی رقم نکالنا مشکل ہوگی تم سے کہا تھا، دس بارہ مرلے کا پلاٹ لے لو مگر تم نے تو کنال کا لفظ منہ سے نکالا اور پورا کرکے چھوڑا۔ اب اس کنال پر گھر بنانا آسان کام ہے!" میں چپ رہنے کا سوچ کر بھی کہہ گیا۔

"ہاں تو ساری زندگی اس چڑیا گھر میں گزاری ہے آتا قدیمہ کے کھنڈر میں کہ برسات ہو یا گرمیوں کی آندھیاں، دل ڈرتا ہی رہتا ہے کہ یہ ملبہ ہمارے اوپر آکر ابھی ہمارا مقبرہ بنائے کہ بنائے۔ اب اگر اتنی دشواریوں کے بعد اللہ نے موقع دیا تو بندہ اتنا گھر تو لے کہ کھل کر سانس آسکے۔ ساری زندگی تو سہم سہم کر گزار دی۔ ایک خوشی تم میری پوری نہیں کرسکتے۔ بہن بھائیوں کے منہ سے نکلا ہر غلط سلط لفظ بھی تمہارے لیے حدیث ہے۔"

وہ حسب توقع نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔ میرے سیل فون کی بیپ بج رہی تھی۔ میں جان چھڑا کر اٹھ گیا۔

"جی جی حاجی صاحب! خیریت سے پہنچ گیا۔ جی اللہ کا شکر ہے۔"

"جی اچھا۔ اچھا آج ہی نکل جاتا ہوں۔ جی میں بس ابھی روانہ ہوتا ہوں۔ گاڑی تو نہیں ہے۔ چلیں کرلوں گا۔ بس میں ابھی گھنٹے بھر میں روانہ ہوتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ جی جی ٹکٹ تو میری بھی کنفرم ہے واپسی کی۔ منگل کو ٹھیک ہے جو آپ کا حکم۔ میں پہنچتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اللہ حافظ۔"

میرے بولنے کے دوران ہی فریدہ اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔

"کہاں کدھر نکل رہے ہیں ابھی؟" وہ بہت سارا غصہ دبا کر پوچھ رہی تھی۔

"میں ذرا گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔ شام تک آجاؤں گا۔ تم کھانا اچھا سا پکا لینا اور یہ سامنے بچوں والا کمرہ تیار کر دینا۔ حاجی صاحب کی بیٹی اور بیوی آئیں گی میرے ساتھ۔ وہ یہاں کسی فوتگی پر آئی تھیں۔ ان کی واپسی میرے ساتھ ہی ہے منگل والے دن۔ کل ہفتہ ہے چار دن وہ ادھر ہی رہیں گی۔ ان کی مدارت میں کوئی کسر نہیں رہنا چاہیے۔ بتا رہا ہوں تمہیں۔"

میں اس سے جلدی جلدی کہتے ہوئے الماری کی طرف اپنے کپڑے لینے کے لیے بڑھ گیا۔ وہ کچھ حیران کچھ پریشان اور کچھ غصے میں لب بھینچے وہیں کھڑی رہی۔

اب وہ حیران ہو یا غصے میں طوفان اٹھائے۔ مجھے اس وقت اس چیز کی پروا نہیں تھی۔ آخر میری روزی کا معاملہ تھا اس پر کوئی کمپرومائز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بڑبڑانے بولنے خفا ہونے کی پروا کیے بغیر میں گھنٹہ بھر میں تیار ہو کر باہر نکل گیا۔

رینٹ اے کار سے ایک گاڑی چار دنوں کے لیے رینٹ پر لی اور پیٹرول پانی بھروا کر گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہو گیا۔



بے بے کے بعد شکیلہ کی شادی منظور کے روزگار اور شادی کا مسئلہ خود بخود میرے ذمے لگ گیا۔

بھا منظور کو تو ان دنوں ایک ہی کام تھا۔ بچے پیدا کرنا اور بیوی کی حمایت میں سب سے لڑائیاں کرنا۔

میں نے مکینکی کا کام پارٹ ٹائم کرتے ہوئے ایک وڈیو شاپ پر نوکری کر لی جہاں ان دنوں زیادہ تر شادیوں پر موویز بنانا، وی سی آر اور وڈیو کیسٹس کرائے پر دینا شامل تھا۔ دو دو نوکریوں کے باوجود بھی گزارہ بہت مشکل سے ہو رہا تھا۔

اوپر تلے تین بچوں کی پیدائش نے میرے اپنے گھریلو اخراجات میں بے تحاشا اضافہ کر دیا تھا پھر بہن بھائی کی ذمہ داری، منظور بھی بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی کوئی کام ٹک کر سنجیدگی سے نہ کرتا تھا۔

یوں بھی ہمارے خاندان میں مردوں کی ہڈ حرامی ضرب المثل تھی۔ انہیں کام کرنا دو بھر لگتا۔

ان دنوں جب میری تنگ دستی عروج پر تھی سپارٹ ٹائم بہت دنوں سے کوئی کام نہیں ملا تھا جب حاجی جمال الدین اپنے بھائی کی شادی کی مووی بنوانے ہماری دکان کی خدمات لینے آئے، وہیں سے میں حاجی صاحب سے متعارف ہوا۔ وہ کئی سالوں سے امریکہ میں تھے اور ایک چھوٹے سے گروسری اسٹور کے مالک بھی بن چکے تھے۔ انہوں نے مجھے امریکہ جانے کو کہا تو پہلی بار مجھے بہت عجیب لگا یہ سن کر۔ اپنا گھر بار ملک شہر چھوڑ کر چلا جاؤں ناممکن؟ فریدہ سے بات کی۔ وہ بھی نہ راضی ہوئی۔ اسے بھی میری رفاقت میں روکھی سوکھی گوارا تھی مگر جدائی نہیں۔

حاجی صاحب مجھے اپنا کارڈ دے کر چلے گئے اور میں بھول بھال بھی گیا حالات دن بدن دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ گزارہ تو دور کی بات اب تو سر پر قرض ہی اتنا چڑھ گیا تھا کہ اتارنے کے لیے بھی الگ سے سرمائے کی ضرورت تھی۔

ان ہی دنوں ہمارے محلے کے ایک لڑکے نے کسی ایجنٹ کے ذریعے سمندری رستے سے امریکہ جانے کا پروگرام بنایا تو میں بھی سوچنے لگا پھر بہت سارے دن اور بہت ساری راتیں ہم دونوں میاں بیوی نے سوچتے ہوئے بالآخر "جدائی" کا بھاری پتھر اپنے سینوں پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایجنٹ کو دینے کے لیے نئے سرے سے قرض لیا گیا اور سب کی دعاؤں کے سائے میں، میں پردیس کے لیے روانہ ہو گیا ان دنوں امریکہ کیا کسی بھی یورپی ملک میں جانا اتنا جان جوکھوں کا کام نہیں تھا۔ اچھی رقم دے کر بندہ قانونی طریقے سے جا سکتا تھا۔ میں اور شکیل نیویارک ہی پہنچے مگر ہمارے پاس نہ تو قانونی ویزا تھا نہ رہائش نہ روزگار۔ چوری چھپے اسی ایجنٹ کے بتائے ہوئے بندوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے۔ بھوکے پیاسے پولیس سے چھپتے۔

وہ چند مہینے میری زندگی کے تلخ ترین مہینے تھے۔ دو تین بار گھر خط لکھا جواباً" فریدہ نے رو رو کر لکھا کہ آپ کسی طرح واپس آجائیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ہم ادھر بھوکوں گزارہ کر لیں گے آپ آجائیں۔"

میں کشمکش میں پڑ گیا کہ شکیل پکڑا گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا اس لیے بچ گیا مگر کب تک؟

پردیس کا ہر اس کم نہیں تھا کہ پکڑے جانے کا خوف، میں گڑگڑا کر سجدے میں گرتا اللہ سے نیک

وسیلے کی دعا کرتا، شاید اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ اچانک مجھے حاجی جمال دین مل گئے انہوں نے میرے ان برے دنوں کے کانٹے یوں چن لیے جیسے کوئی دوا کسی درد کے مارے مریض کا درد چنتی ہے۔

وہ دن اور آج کا دن۔ حاجی صاحب کے احسانات کا پلڑا اونچا ہی ہوتا چلا گیا۔ اب انہوں نے اگر مجھے یہ معمولی سا کام کہا تو کیا میں نہ کرتا۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں دوپہر تک گوجرانوالہ کے اس نواحی گاؤں میں پہنچ گیا اور شام سے پہلے ان دونوں خواتین کو لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ حاجی صاحب کی بیگم کی بہن فوت ہو گئی تھیں جس کے پرسے کے لیے وہ پاکستان آئی تھیں۔

"میرا تو سیل فون راستے میں کہیں بیگ سے گر گیا تھا جبکہ زہرہ کا کسی نے چپکے سے نکال لیا۔ فون کے لیے ادھر گاؤں کے اکلوتے پی سی او پر جانا پڑتا، سوچا تھا شام کو جا کر فون کر کے حاجی صاحب کو بتا دوں گی کہ ہم خیریت سے ہیں۔" حاجی صاحب کی بیگم نے رابطہ نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

دونوں خواتین اس گرم موسم میں بھی عبایا پہنے ہوئے اور اسکارف لیے ہوئے تھیں۔ میرا ان دونوں سے احترام کا رشتہ تھا کہ آج تک میرا ان دونوں ماں بیٹی سے سامنا ہو بھی جاتا تو کبھی نظر نہیں ملی تھی۔ میری شرافت اور حاجی صاحب کے احسانات مجھے نگاہ اٹھانے ہی نہ دیتے۔

"ابھی تک ان علاقوں کی وہی حالت ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے تھی، دیکھ کر دل ہی دکھتا رہا ہے۔ غربت، جہالت اور سہولتوں کی کمی جیسے کوئی ان لوگوں کا والی وارث ہی نہیں۔" بیگم جمال دین دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ "اور یہ غربت اور انتہا درجے کی مفلسی ہی تو ہے جو اچھے بھلے، شریف بھلے مانس لوگوں کو عیاری اور دھوکا دہی پر اکساتی ہے۔ ہم کسی کو کیا الزام دیں۔"

آخر میں وہ ایک آہ سی بھر کر چپ ہو گئیں تو میں نے نادانستگی میں زہرہ جمال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ گاڑی کے بند شیشوں سے باہر دھول اڑاتی ٹوٹے کرکٹ اور گند سے اٹی سڑکوں اور راستوں کو پلک جھپکے بغیر دیکھ رہی تھی۔

"ہم گناہگار ہوتے اپنے اللہ کے بھی، اپنی بیٹی کے بھی اور اس نعیم کی بیوی اور دو بچوں کے بھی۔ ہمارا آنا کام کر گیا۔" بیگم جمال بولیں تو میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"نعیم کی بیوی اور بچے!" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں اور فقط اپنے پیر جمانے کی خاطر اس نے اپنی بیوی، اس کے گھر والوں اور اپنے گھر والوں کو سختی سے تاکید کر دی کہ کوئی تحقیق کرنے آئے تو کہہ دینا۔ نعیم تو اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ اللہ میری توبہ، پیسے کے لیے یہ لوگ کیسے کیسے مقدس رشتوں کو داغ دار کر ڈالتے ہیں۔ میں نے سب سن کر اپنے لب ہی سیے رکھے۔ جھگڑتے بھی تو کس سے۔ پہلے ہماری بچی کے ساتھ دھوکا ہوا۔ الٹا ہم نے ہرجانہ ادا کیا اب اگر یہ نعیم۔۔۔"

"پلیز امی جان! چینج دا ٹاپک۔۔۔" زہرہ جمال کی فراخ پیشانی پر بڑا نمایاں بل آیا تھا اور لہجے میں کیا کچھ چٹخا تھا کہ بیگم جمال نے لب بھینچ لیے۔

زہرہ کی پہلی شادی بھی حاجی صاحب کے کسی رشتہ دار سے ادھر نیویارک میں ہی ہوئی تھی جسے انہوں نے سیٹل ہونے کے لیے اپنے پاس رکھا تھا۔ زہرہ سے شادی کرتے ہی اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ سب کچھ فی الفور اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا، جب زہرہ نے اس کے گھٹیا مطالبات والدین کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا تو وہ انسان سے شیطان بن گیا ایسے ایسے تشدد اس پر کرتا رہا کہ حاجی صاحب کی بیان کرتے ہوئے داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

انہوں نے لاکھوں روپے اس لالچی گدھ کو دے کر اپنی بیٹی کی جان چھڑائی اور اب یہ نعیم۔ یہ بیگم جمال کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ پڑھا لکھا۔ حاجی صاحب

نے ہی بلوا کر نوکری دلوائی کہ خود منہ سے زہرہ کا رشتہ مانگ بیٹھا۔ وہ پہلے سے ڈرے ہوئے تھے۔ سو بیگم جمال کی بہن کی موت بہانا بنی۔ انہوں نے دونوں کو نعیم سے بالا ہی پاکستان ایک ہفتے کے لیے بھجوا دیا اور اگلے روز گھبرا کر مجھے بھی روانہ کر دیا کہ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے اور مسئلہ ہو ہی گیا۔ نعیم بھی دوہرے چہرے والا نکلا۔ اوپر سے مہذب اور معصوم۔ در حقیقت وہی لالچ حرص طمع کا مارا ہوا۔

"بے چاری زہرہ جمال۔" گھر کی گلی مڑتے ہوئے میں نے ایک تاسف بھری نگاہ زہرہ کے سادہ سے چہرے پر ڈالی اور گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"اب میں سمجھی تم کیسے وہاں اتنے "صبر" سے بیٹھے رہتے ہو، ڈھائی تین تین سال مڑ کر نہیں دیکھتے۔ مرد ہو کر ایسی برداشت۔ تبھی تو میرا دل یقین نہیں کرتا تھا۔ مدثر میاں! تم تو چھپے رستم نکلے۔ ارے جب ہر گھڑی ایسا معصوم فتنہ صورت کے سامنے ہو تو کس کافر کو بیوی جیسی مدقوق چیز یاد آئے گی۔ بس آج مجھے صاف صاف بتاؤ۔ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور یہ کون ہے اور تمہارے دل میں کہاں ہے؟ کہاں تک ہے!"

میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ فریدہ ایسا ہنگامہ کرے گی۔ اگرچہ یہ ہنگامہ رات گئے بند کمرے میں بپا تھا مگر یہ کمرہ کوئی دنیا کے آخری کنارے پر تو تھا نہیں اسی کمرے میں اس کی دیوار جڑی تھی جس میں بیگم جمال دین اور زہرہ جمال سو رہی تھیں اور فریدہ کی پھٹے بانس جیسی آواز میری گھر کی منت واسطے سب بے کار۔ وہ تو بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی۔

"کیا۔ کیا۔ ہاتھ آیا مجھ بد نصیب کے۔ دیکھو دیکھو۔ اس جدائی نے میری کیا حالت کر ڈالی۔ لوگ ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔ فریدہ کوئی بیماری تو نہیں لگ گئی تجھے اور میں نصیبوں جلی کیا بتاؤں انہیں۔ مجھے چھوڑنے کا سارا لگا ہے۔ اپنے ہی شوہر کو اپنے ہاتھوں خود سے دور کر کے کیا ہاتھ آیا میرے۔ میرا بد روح بنتا جسم اسی کھنڈر میں پڑا گل سڑ رہا ہے اور وہ۔ وہ ڈالر کمانے کے بہانے وہاں عیش کر رہا ہے۔ اسے تو کوئی بیماری کوئی روگ نہیں لگا۔ بھلا چنگا مجھ سے دونا (دوگنا) پُرشباب اور میں۔ میں کیا ہو گئی۔ آج راز ہاتھ لگا تمہارے اس اطمینان کا۔ دلاسوں اور جھوٹی قسموں کا۔"

وہ اب رونا شروع ہو چکی تھی۔

"خدا کا واسطہ ہے فریدہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اللہ رسول کی قسم کھاتا ہوں۔ تمہارے سر کی قسم۔" میں لجاجت سے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس کے سر کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بدک کر یوں پرے ہوئی جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔

"مر جاؤں گی جو کھا کر! اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ جب تک ثابت نہیں کرو گے اس سونے کی کان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔" وہ منہ زور بنی ہوئی تھی۔

"کیسے۔ کیسے ثابت کروں؟" میں بے بسی کی انتہا پر تھا۔

اور تنگ آ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر صحن میں ٹہلتا رہا پھر شکستہ قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ اور شاید چودھویں کا چاند تھا۔ ہر طرف دودھیا چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ خستہ حال اینٹوں کی منڈیروں والی چھوٹی سی چھت جہاں پتنگیں اڑاتے لوٹتے میرے بچپن کی دوپہریں اور سہ پہریں گزری تھیں اس وقت کیسے اجنبی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے تھک کر میں سیمنٹ کے بنے ٹوٹے پھوٹے شہ نشین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر فریدہ کے اشتعال پر غور کرتے جلتے کڑھتے سوچتا رہا پھر کب وہیں لڑھک کر میری آنکھ لگ گئی مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

صبح سورج کی تیز کرنوں نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا تو تھوڑی دیر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ادھر کیسے آیا پھر رات کا سارا منظر یاد آتے ہی میں تیزی سے نیچے

زینے کی طرف لپکا۔ وہ بیوقوف عورت نہ جانے ان دونوں سے کیا بک بیٹھے اور۔۔۔" اس سے آگے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ نیچے مکمل خاموشی تھی' دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔

میں نے شکر کا کلمہ پڑھا اور صحن میں بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔



پھر باقی کے چار دن فریدہ کا موڈ اسی طرح سیخ پر چڑھے کباب کی طرح جلا بھنا ہی رہا۔ اس کے مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے بھی اسے دوبارہ نہیں چھیڑا۔ پتا نہیں بیگم جمال اور زہرہ کیا سمجھیں۔ کیا نہیں' بہرحال اگلے دن وہ اپنے عزیزوں سے ملنے چلی گئیں اور تیسرے دن ہی واپس آئیں جب اگلی صبح ہماری روانگی تھی۔

میں نے ان دنوں میں پلاٹ کا نقشہ دیکھ کر پسند کر لیا تھا گھر کی بنیادوں کا کافی کام میرے سامنے ہی ہو گیا۔

"جتنے پیسے بینک میں ہیں۔ اس سے بمشکل دیواریں کھڑی ہوں گی۔ باقی کے لیے کیا کریں گے؟"

یہ واحد گفتگو تھی جو فریدہ نے ان تین دنوں کی ناراضی کے دوران ذرا آرام سے کی تھی۔

"دیکھتا ہوں جا کر۔" میں شگفتگی سے بولا' حقیقتاً مجھے اس کے رویے نے بہت دکھ دیا تھا۔ وہ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہے اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

بیگم جمال اور زہرہ نے اسے سونے کے سیٹ کا تحفہ دیا تھا جسے اس نے بڑی نخوت سے احسان کر کے لیا تھا بعد میں میں نے اسے اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ اسے بھی جاتے ہوئے انہیں کچھ تحائف دینے چاہئیں مگر وہ ان سنا کر کے پھرتی رہی۔ آخری شام میں خود ہی انار کلی جا کر ان دونوں کے لیے کپڑے پیک کروا کے لے آیا اور فریدہ کے ادھر ادھر ہوتے ہی بیگم جمال کو فریدہ کی طرف سے کہہ کر دے دیے۔ اس لمحے زہرہ کے چہرے پر کیسی ذو معنی مسکراہٹ تھی کہ میں خواہ مخواہ شرمندہ سا ہو گیا۔

اور یہ میری بدقسمتی کہ فریدہ کو ان تحائف کا علم ہو گیا شاید چھوٹی ثریا نے بتایا ہو' اس کے اندر جیسے کوئی منہ بند آتش فشاں کھولنے لگا۔

"اب تم جا رہے ہو تو بہتر ہے وہاں سے کوئی فیصلہ مجھے لکھ بھیجو۔ میں تمہاری جدائی تو سہہ سکتی ہوں پر اپنے سہاگ میں دوئی نہیں برداشت کر سکتی' دوسری عورت خواہ کسی بھی تعلق سے تمہارے نزدیک ہو میں مر کر بھی گوارا نہیں کر سکتی۔"

اور یہ بھی میری بدقسمتی تھی کہ میں نے فریدہ کو بتا رکھا تھا کہ حاجی صاحب کی بیٹی پہلی شادی کے بدترین تجربے کے بعد اسٹور کے آفس میں آکر بیٹھنے لگی ہے اور میں اس کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا ہوں' اس نے میری بات کو یونہی لیا تھا کہ حاجی صاحب کی بیٹی کوئی عمر رسیدہ' معمولی شکل کی یونہی سی عورت ہوگی یا شاید آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ تھا اور اب زہرہ کو دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو گئی تھی۔ شاید تصوراتی طور پر اس نے میرے اور زہرہ کے بیچ کوئی بہت ہی قریبی تعلق بنا بھی لیا تھا اور میں اس خیال پر ہی لاحول پڑھتا رہتا۔

صد شکر کہ ہماری روانگی کا وقت آگیا۔

فریدہ کی ناراضی اور غصے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا' وہ یوں دیوانوں کی طرح مجھے چاہتی ہے کہ مجھے تصور میں بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ اس کے غصے پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور پیار بھی۔

"اب جا کر حاجی صاحب سے کہوں گا۔ مجھے ایک مہینے کی چھٹی دیں۔ میں اپنے گھر کا کام مکمل کروانا چاہتا ہوں اور اپنی اتنی محبت کرنے والی بیوی کے سارے گلے شکوے دور کرنا چاہتا ہوں۔"

میں ایئرپورٹ روانہ ہونے سے پہلے دل میں ارادہ باندھ رہا تھا اور مجھے نہیں پتا تھا کہ ایک ارادہ قدرت بھی باندھ رہی تھی۔



"میری زندگی اب شاید چھ مہینے ہیں یا سال بھر' ڈاکٹرز کا یہی کہنا ہے کہ پیٹ کا کینسر میرے سارے وجود میں پنجے گاڑ چکا ہے۔ مجھ میں نہیں آتا اگر میرے اللہ نے میری بیٹی کو یونہی تشنہ لب رکھنا تھا تو مجھے تھوڑی مہلت ہی زیادہ دے دیتا۔ سال دو سال۔ میں کیا کروں مدثر! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

حاجی صاحب ہماری آمد کے تیسرے دن میرے اپارٹمنٹ پر تشریف لائے تھے اور اسی طرح بھیگی داڑھی کے ساتھ کہہ رہے تھے اور میں تو یہ انکشاف سن کر ہی بھونچکا رہ گیا تھا۔

"یہ۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب' آپ اللہ آپ کو سلامت۔۔۔" میں نے سنبھل کر کہنا چاہا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

"آج تمہارے سامنے جھولی پھیلا کر آیا ہوں۔ میری بیٹی جیسی بھی ہے تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ شرع کسی بھی مسلمان کو چار شادیوں کی اجازت دیتی ہے اگر وہ کفالت کر سکے۔ میرا سارا بزنس گھر سب زہرہ کا ہے تم بس اسے اپنا تحفظ دے دو۔ میں قبر میں لیٹا بھی تمہارے لیے دعا کرتا رہوں گا۔ میرا مان رکھ لو مدثر! میرا بیٹا بن کر مجھے اس اذیت ناک موت سے بچا لو۔ اپنی بیٹی کو یوں اس شہر بے اماں میں چھوڑ کر میں آرام سے مر بھی نہیں سکوں گا۔"

وہ ہچکیوں سے رو رہے تھے اور میں گنگ بیٹھا تھا۔

"حاجی صاحب پلیز' حوصلہ کریں اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آپ جانتے ہیں میں شادی شدہ ہوں اور میرے جوان ہوتے بچے۔۔۔ اللہ کوئی نہ کوئی رستہ۔۔۔"

"اللہ کے آگے گڑگڑا تا رہا ہوں' وسیلہ مانگتا رہا ہوں اب اس کا واسطہ دے کر تمہارے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو مدثر! مجھ مرتے ہوئے بوڑھے پر۔۔۔" وہ جھک کر میرے قدموں پر ڈھیر ہونے کو تھے کہ میں نے لپک کر انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"حاجی صاحب! مجھے گناہ گار نہ کریں۔ پلیز۔ میں سوچتا ہوں۔ آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔ پلیز حوصلہ کریں۔ خود کو سنبھالیں۔" میں انہیں سنبھالتے ہوئے خود بکھر رہا تھا۔

یہ تقدیر نے مجھے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

اگر حاجی صاحب کے احسانات کو دیکھتے ہوئے ان کے بستر مرگ پر پڑے وجود کا خیال کر کے زہرہ سے شادی کی ہامی بھرتا ہوں تو فریدہ کے شکوک کو یقین میں بدل دوں گا اور اگر حاجی صاحب کو انکار کر کے اپنی محبت کو سرخرو کرنا چاہتا ہوں تو روزی' روزگار سے جاؤں گا' اوہ میرے خدایا یہ کیسا مشکل فیصلہ تھا۔

دو راتیں جاگنے اور دن رات سگریٹ پھونکنے کے باوجود بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

"یہ شہر اسی وقت تک آپ کا ہے جب تک آپ کی جیب ڈالروں سے بھری رہتی ہے۔ سر پر اپنی چھت ہو تو پھر کوئی بے اماں نہیں ہوتا۔ زہرہ جمال کی جیب ہی ڈالروں سے نہیں بھری بلکہ اس کے سر پر اپنی چھت بھی ہے جبکہ فریدہ اور میرے بچے تو اس خستہ حال کھنڈر میں بے اماں پڑے ہیں اگر اس برسات میں زوروں کی بارشیں ہوئیں تو کہیں میرے دامن میں عمر بھر کے پچھتاوے نہ رہ جائیں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔۔۔ میں فریدہ سے اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ بالکل نہیں۔"

دوسری رات کے آخری پہر فیصلہ ہو گیا اور میں نے بیگ نکال کر اپنی پیکنگ شروع کر دی اور حاجی صاحب کو بتائے بغیر دو دن بعد سیٹ ملتے ہی پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا اور مجھے خوشی تھی۔ اس بات کی کہ یہ میرا پردیس سے اپنے گھر کی طرف حتمی سفر ہے۔ اب میرے اور میری بیوی اور بچوں کے بیچ کوئی سفر' کوئی دوری نہیں آئے گی۔ اسی سرشاری نے ایک بار پھر مجھے محو پرواز ہونے کی طاقت دی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں حاجی صاحب کی بے بسی اور ان کے آنسو بھی بھول گیا۔

اور زہرہ جمال تو میرے خیالوں میں کہیں تھی ہی نہیں!



"پلاٹ اور یہ گھر بیچ کر ہم کوئی چھوٹا سا مناسب گھر

لے لیں گے اور جو سیونگ اکاؤنٹ میں تین لاکھ روپے ہیں ان سے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کردوں گا تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

میں بے حد مطمئن' پُرسکون سا ایک بار پھر فریدہ کے پہلو سے لگا ہوا اسے اپنی پلاننگ سے آگاہ کررہا تھا۔ میرا دل اور دماغ اتنا ہلکا پھلکا تھا جیسے ان پر کوئی وزن تھا ہی نہیں۔

"اور وہ میرے شان دار گھر کے خواب۔۔۔" مجھے لگا فریدہ کی آنکھوں میں اس ٹوٹتے خواب کی کرچیاں بڑے زور سے چبھی ہیں۔

"کچھ عرصہ انتظار کرلو' تھوڑا سیٹ ہوتے ہی ہم۔"

"خدا کے لیے۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑی "کتنی لمبی عمر نظر آتی ہے تمہیں میری۔ کیا لاکھی ٹیکتی آنکھوں میں بس سائے دیکھنے کی چمک لیے اپنے خواب کی تعبیر دیکھوں گی۔ پچھلے گیارہ سالوں سے تم مجھے اپنے عالیشان محل جیسے خواب سے بہلا رہے ہو اور اب پھر خالی ہاتھ۔ خالی دامن لیے چلے آئے ہو نئے خوابوں کے بہلاوے لے کر۔"

وہ کس زاویے سے بول رہی تھی۔ لمحہ بھر کو میں الکل سمجھ نہیں سکا۔

"اور وہ جو تین لاکھ کا راگ الاپ رہے ہو' خود ہی تم نے کہا تھا اس میں سے راشد بھائی کو اپنے گھر کی تعمیر کے لیے دو لاکھ روپے دے دو۔ جب ہم بنانا شروع کریں گے تو لے لیں گے اور انہوں نے تو ابھی گھر بنانا شروع ہی کیا ہے۔ وہ کہاں سے لوٹائیں گے۔ باقی ایک لاکھ سے کیا کرو گے۔ بتاؤ ذرا۔ یہاں ایک ڈیڑھ مرلے کا ایک کمرے کا گھر پندرہ لاکھ میں مل رہا ہے اور یہ کھنڈر جسے تم جاتے ہوئے اپنے بڑے بھائی جان کے نام کرنے کا وعدہ کرچکے ہو' وہ کیا تمہیں کرنے دیں گے۔"

وہ بول رہی تھی کہ چیخ رہی تھی۔ گیلی لکڑی کی طرح اس میں سے چنگاریاں اور دھواں نکل رہے تھے اور میں ٹکر ٹکر آنکھوں میں چبھتے دھوئیں کی پروا کیے بغیر اسے دیکھے جارہا تھا۔

"اور۔۔۔ اور بچے۔۔۔ ان کو جو پچھلے سال مہنگے ترین اسکولوں میں داخل کرایا ہے' دو چار سالوں میں کالجوں میں اور پھر ان کی شادیاں۔۔۔ ساری عمر تو کما کما کر بہن بھائیوں میں لٹاتے رہے ہو۔ اب اپنے بچوں کا ٹائم آیا تو کفایت شعاری' قناعت اور روکھی سوکھی کے سارے درس یاد آگئے۔" وہ ایک کے بعد ایک آئینہ تڑاتڑ توڑے جارہی تھی اور میں کسی بت کی طرح بے حس بیٹھا تھا۔

میری مسلسل چپ پر اس نے آخری حربے کے طور پر پھپک پھپک کے رونا شروع کردیا۔

وہ روئے جارہی تھی اور میں۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسے دلاسا دوں تو کن الفاظ میں۔۔۔ اسے اس وقت لفظوں' کھوکھلے لفظوں اور غیر مرئی خوابوں کی ضرورت نہیں تھی۔

"پھر کس چیز کی ضرورت تھی؟" میں نے خالی الذہنی سے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"تو۔۔۔ تو کیا کروں۔" میری آواز کسی گہرے اندھیرے کنوئیں سے آئی تھی۔ آئی بھی تھی یا میرا وہم تھا۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ واپس چلے جاؤ۔" اس نے میرا واہمہ سن لیا تھا۔

"واپس؟" میرے لب بے وقت ہلے۔

"ہاں۔ تم پہلی بار اپنی مرضی سے گئے تھے۔ اپنی خوشی سے۔ اس بار ہمارے لیے' اپنے بچوں کے لیے۔۔۔"

اس نے پہلی بار جانے کو بھی میری خوشی قرار دے دیا۔ عورت بہت سارے تاوان' ذمہ داریوں کی صورت مرد کے کندھوں پر رکھ دیا کرتی ہے۔

"اور۔۔۔ واپس جانے کی قیمت۔۔۔ معلوم ہے تمہیں؟" میں نے تلخی سے اسے دیکھا۔ ہماری گفتگو اسی مقام پر آکر ختم ہوگئی جہاں سے چلی تھی۔

لمحے ہم دونوں کے بیچ سائیں سائیں کرتے سرکنے لگے۔

"تم جاکر زہرہ جمال سے شادی کرلو۔ میں۔۔۔ میں خود۔۔۔ خوشی سے اجازت دیتی ہوں۔"

مجھے امید تھی۔ یہ بم پھوڑتے ہوئے وہ دھاڑیں مار کر روئے گی۔ مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنسوؤں سے دھو گیلا تھوڑا خشک مگر بالکل سپاٹ۔

"تم زہرہ جمال سے شادی کرلو۔" اس نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہو۔ تم دوسرے کمرے میں جاکر سو جاؤ!

"اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ بتانا اپنے گھر والوں کو۔۔۔ اور بتا بھی دو تو انہیں پروا نہیں ہونا چاہیے جب مجھے پروا نہیں ہو تو۔۔۔ ہاں۔"

اس نے ذرا دلبرے انداز میں کہتے ہوئے انگلی سے میرے رخسار کو چھوا۔

میرا سر جھک گیا۔

"ابھی یہاں کسی کو پتا نہیں کہ تم آئے ہو اور ہمارے حاجی صاحب کو بھی شاید نہ علم ہو اور اگر ہو بھی تو کوئی مضبوط بہانہ۔۔۔ کہ بیوی۔۔۔ بیوی مرتے مرتے بچی۔۔۔ اس کا پتا کرنے گیا تھا یا کہہ دینا۔۔۔ وہ زندگی۔۔۔ مرگئی۔۔۔" اس نے بے تاثر سے لہجے میں کہا کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"عورت کیا چیز ہے اور مرد کا مقدر۔۔۔ کیا ہے مرد کا مقدر؟ ساری زندگی عورت کی خوشی' اس کی رضا کے لیے بھینٹ چڑھتا رہے اور پھر بھی۔۔۔ بے وفا ہرجائی ہی کہلاتا رہے۔۔۔ یہ کیسا مقدر ہے مرد کا۔۔۔ سارے فیصلے۔۔۔ ظالمانہ' کٹھور فیصلے عورت کرے پھر بھی وہی مظلوم کہلائے۔ مرد ظالم جابر۔۔۔ جیسے جیسے۔۔۔ سب سنیں گے تو مجھ پر سو بار لعنتیں بھیجیں گے کہ وفادار بیوی کو لات مار کر دوسری عورت کو دولت کی ہوس میں اپنالیا۔ مجھ سے بڑا ظالم کون ہوگا اور فریدہ سے بڑھ کر مظلوم کون؟

میں یہ سب کچھ جانتا تھا۔ فریدہ کے فیصلے کے آگے سر جھکانے کے باوجود سمجھتا تھا کہ میں خود پر کیا ظلم ڈھانے جارہا ہوں۔ ساری دنیا کی ملامت سہنے جارہا ہوں اور اس ظالمانہ فیصلے کی ڈوری جس کے ہاتھ میں ہے' وہ سب کی نظروں میں مظلوم ہوگی بے چاری بے بس۔۔۔ اور پھر بھی۔۔۔ پھر بھی میں نے اس کے فیصلے پر عمل کیا کھوٹ اس کی محبت میں تھا یا میرے ارادے میں؟ میری قسمیں بودی تھیں یا فریدہ کی محبت کمزور۔۔۔ یا ان دونوں سے بھی بڑی کوئی حقیقت ہے اس کرہ ارض کی' اس دور کی سب سے بڑی حقیقت!

عاشق کی پہچان' محبوبہ کی محبت' بے لچک ارادے اور سچی محبت سے طاقت ور۔۔۔ دولت کی حقیقت۔۔۔ ڈالر کی طاقت۔۔۔ جس کے آگے فریدہ کی محبت سرنگوں ہوگئی اور میری قسمیں' وعدے' ارادے سب۔۔۔ سب مٹی کا ڈھیر ہوگئے۔

میں جتنا سوچتا ہوں' اتنا الجھتا ہوں۔

ان تین ریشمی دھاگوں کی ڈور الجھتی جارہی ہے اور میرے ہاتھ' میرا دماغ ان تین ریشمی الجھنوں کو سلجھاتے سلجھاتے لہو ہورہا ہے۔

محبت' یقین اور دولت۔۔۔

ان میں سے کس کی ڈور سب سے مضبوط اور غالب ہے۔۔۔ وہ حقیقت جس کو مان کر میں اپنی بیوی' اپنے شہر' اپنے گھر اور گلیوں کو غیر معینہ مدت کے لیے الوداع کہہ آیا ہوں۔ آخر اس غیر متزلزل حقیقت کو میرا دل کیوں نہیں مان رہا۔ شاید محبت اور یقین کی کوئی بجھی ہوئی چنگاری سلگ رہی ہے۔ بجھ جائے گی۔

دولت کے ڈھیر کے نیچے دب کر وہ بھی بجھ جائے گی۔

میں نے تھک کر اپنا سر جہاز کی سیٹ سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

